Fikr-o-Nasar (Islamabad) 14:6-7 (1976-77)

قائداعظمؒ کی سوانح عمریاں

وحید قریشی

قائداعظم کے بارے میں مختلف زبانوں میں کتب و رسائل کا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔[1] انگریزی میں ایسی کتابوں کی تعداد دوسری زبانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ تحریک پاکستان پر غیر ملکی دانشوروں کی کتابوں کے علاوہ خود برصغیر میں قائد کی شخصیت اور زندگی کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی مقدار بھی قابل اعتنا ہے۔ مسلمان اور ہندو مورخین نے شخصیت اور سیاسی کردار کے بارے میں جو آراء دی ہیں ان میں اختلاف بھی ہے اس لئے اس ذخیرے کی چھان بین اور مستند اور غیر مستند مواد کا امتیاز وقت کا اہم فریضہ ہے جو کسی فردِ واحد کے بس کا نہیں۔ لیکن اس سرمایۂ خاص میں سے چند معروف کتابوں کا تجزیہ شاید بے موقع بھی نہیں۔

تاریخی نقطہ نظر سے حقائق کی از سرِ نو نشان دہی بجائے خود ایک اہم کام ہے، لیکن سوانحی کتب کو تمدنی تحریکات کے پس منظر میں رکھ کر ان کا فنی اور ادبی جائزہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ تاریخ اور ادب کی سرحدیں آپس میں مل جاتی ھیں۔ سوانح نگاری تاریخ کا شعبہ ہے لیکن مورخ اپنے مواد کی ترتیب اور خیالات کے اظہار میں تکنیکی ذرائع پر بھی بھروسہ کرتا ہے۔ یہ ذرائع کا ملاً ادبی ہیں۔ اس اعتبار سے تکنیکی سطح پر ان سوانح عمریوں کا مطالعہ اور ان کی تہہ میں کارفرما فکری اور جذباتی رویوں کی تلاش ضروری ہو جاتی ہے۔

(1) Quaid-e-Azam a Selected Bibliography. Muhammad Anwar. National Publishing House, 1970 pp 29-36.

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

(۲)

آج کی محفل میں جن کتابوں کو منتخب کیا گیا ہے ان کے نام یہ ہیں:

Meet Mr. Jinnah	A. A. Ravoof. (1944).
My Leader	Z. A. Suleri
The Great Leader	S. Abdul Latif (1946).
Jinnah	Hector Bolitho (1954)
Glimpses of Quaid-e-Azam	Jamil-ud-Din Ahmad (1960).
Quaid-e-Azam As I knew him.	M. H. Isfahani (1960).
Quaid-e-Azam Jinnah The Story of a Nation	G. Allana (1967)
Jinnah and the Making of Pakistan.	Saber M. M. Qureshi (1969).

(۳)

قائد اعظم پر پہلی مستقل تحریر شاید سروجنی نائیڈو کے قلم سے نکلی تھی، جس میں قائد کو ۱۹۱۸ء میں ہندو مسلم اتحاد کا سفیر قرار دیا گیا تھا۔ لیکن جب مسلم لیگ نے قرارداد لاہور منظور کی اور حصول پاکستان کے لئے عملی جد و جہد کا آغاز کیا۔ اس وقت قائد کے خلاف اور حق میں، چھوٹے چھوٹے کتابچے شائع ہونے لگے جن میں بعض کا لہجہ تند بلکہ تلخ بھی تھا۔ ان میں قائد کا موازنہ کبھی ہٹلر سے کیا جاتا کبھی مسولینی سے کہ یہی دو شخصیتیں دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں دُنیا میں گمراہی اور آمریت کی علامت تھیں۔ اس طرح کے تقابل کے علاوہ قائد کے کردار، بیانات اور تقاریر کی تحریف بھی ہوتی اور ان کے نصب العین کے خلاف جوش و خروش کا اظہار بھی کیا جاتا۔ ہندو اخبار نویسوں کے علاوہ مجلس احرار اور نیشنلسٹ علما بھی بہت سرگرم تھے۔ لب و لہجے کے اعتبار سے یہ تحریریں صحافتی سرگرمی کو ظاہر کرتی ہیں۔ جن میں دلائل سے زیادہ جذبات نمایاں ہیں۔

(۴)

مذکورہ کتابیں ہماری فکر و نظر کی تاریخ کا رخ بھی متعین کرتی ہیں اور سماجی فعل ہونے کے سبب سے خود سماجی تاریخ کی غلام بھی ہیں۔ یہ برصغیر کے سماجی تناظر کا بھی حصہ ہیں۔ اس لئے ادبی اور سماجی مسائل کے حوالے سے انہیں کاملاً آزاد نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ان کے بیخ و بُن ہماری سماجی اور فکری تاریخ ہی سے جنم لیتے ہیں اس لئے اس دور کی سماجی تحریکات اور ادبی اقدار کے توسط سے ان کے پس پردہ عوامل کی شناخت بھی ممکن ہے۔

علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کیا۔ تعلیمی، مذہبی اور فلسفیانہ مسائل میں جدیدیت کی تلاش ان کے کارناموں کا امتیازی باب ہے۔ لیکن اس تحریک میں، بعض منفی فکری لہریں بھی تھیں جن کا ارتعاش آج بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انگریز پرستی نے مسلمانوں کو اس حد تک احساس کمتری میں بھی مبتلا کیا کہ تحریک خلافت اور ترک موالات بھی اپنی شدت کے باوجود اس اثر کو پوری طرح زائل نہ کرسکیں۔ سرسید کی عقل پسندی،، نے جذبات کو برگ و بار لانے سے روکا لیکن جذبات بالآخر سماجی سطح پر دوبارہ بحال ہوئے اور اس کا براہ راست اثر سرسید کی تعلیمی درس گاہ پر بھی ہوا اور ایک نیا سماجی (Synthesis) ابھر آیا۔ ادبی سطح پر ان ہر دو رجحانات نے کچھ نئی شکلیں اختیار کیں۔ ہمارے مصنفین نے بنگال کے ہندو مصنفین کی پیروی میں مغرب سے مرعوبیت کو اس طرح ظاہر کیا کہ اپنے ہاں کی ہر بات کا موازنہ مغرب سے ہونے لگا۔ گوئٹے اور اقبال، نظیر اکبرآبادی اور شیکسپیئر، انیس اور ہیومر کے موازنے اس دور میں عام ہیں۔ اس کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ مغرب سے آنے والی ہر چیز ہمارے لئے معیار بن گئی اور اپنے ادب کا جب بھی ذکر آتا ہے ادیب ایک خاص طرح کے احساس ندامت میں ڈوب جاتے۔ یہ دونوں رجحانات قائداعظم کی سوانح عمریوں میں بھی ظاہر ہوئے ہیں۔ سیاسی میدان میں تقابل اور موازنے کی وبا نے مغرب کا بھرم قائم کیا The Great Leader کا مصنف اس دیسی اور بدیسی کے تقابل کی بجائے ہندو اور مسلمان کا تقابل سامنے رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک قائداعظم کی راست گفتاری اپنے ماحول اور مزاج کی بجائے گوکھلے سے مستعار ہے:

It was Gokhale who taught
Mr. Jinnah honesty without humbug.

اس کتاب کا پورا خمیر تقابل پر منحصر ہے۔ گوکھلے، راناڈے، گاندھی اور جناح کے افکار کا موازنہ کتاب کے متن کو مخصوص اسلوب مہیا کرتا ہے۔ اس میکانیکی طرز کی بنا پر پوری کتاب کا قالب الجھ گیا ہے اور قائد کے کردار کا مجموعی تاثر قاری کی گرفت سے نکل جاتا ہے۔ یہ مرض تقابل آج تک مورخین کو لاحق ہے، ایم ایم قریشی کی کتاب میں یہ اثر سمٹ کر ایک باب میں محصور ہوگیا ہے چنانچہ انہوں نے سرسید، اقبال اور جناح کا موازنہ کرنے کے لئے الگ باب باندھا

ہے۔

دوسرا فکری رویہ انکسار آمیزی پر منحصر ہے۔ ہمارے ادیب مغرب کی برتری کو غیر شعوری طور پر محسوس کرتے ہوئے اعتذار اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے اقوال کی صداقت منوانے کے لئے مغربی مشاہیر کے اقوال سے تائید حاصل کرتے ہیں اور اپنے متن انگریز اور دوسرے غیر ملکی مصنفین کے اقتباسات سے سجاتے ہیں۔ اسی رجحان کی ایک تیسری صورت یہ بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ بعض اوقات مصنف اپنے استدلال کو کمزور محسوس کرتے ہوئے جوابی یا الزامی انداز استعمال میں لاتے ہیں جو اپنی بے بسی اور بے چارگی کا ایک چھپا ڈھکا طریقہ ہے۔ ادبی تحریرات میں ابھرنے والا یہ ڈر اور خوف سوانح کی کتابوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ جمیل الدین احمد نے اس خوف کو جارحانہ حملوں کی صورت دے دی ہے۔ اور جوابی کارروائی کے لئے الگ باب باندھا ہے۔ لہجے کی تندی اور تیزی دوسرے مصنفین کے ہاں بھی کبھی کبھار ملتی ہے اور یہ طوفان ابھی تک نہیں تھما۔ سلیم۔ ایم۔ ایم قریشی کی کتاب (Jinnah and the Making of Pakistan) میں کیبنٹ مشن کے بارے میں جس رنگ میں قائد کا دفاع کیا ہے اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان اثرات سے ابھی تک تاریخ نویسی دامن نہیں بچا سکی۔

(۵)

تحریک علی گڑھ کے اثرات کے علاوہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کی بعض ادبی اور نیم ادبی تحریکیں ان کتب میں جھانکتی دکھائی دیتی ہیں۔ ادب میں خلافت اور دوسری پرجوش تحریکوں نے اپنا رنگ جمایا تھا۔ ظفر علی خان اور ابو الکلام آزاد کی شعلہ بیانیاں اپنا اثر چھوڑ گئیں۔ جوش و ہیجان نے رومانی تحریک میں مبالغے کا عنصر مضبوط کیا۔ یہی جوش اور خطابت شاعری میں اقبال کے ہاں بھی ملتا ہے۔ سماجی عسکری اور رفاہی تحریکیں بھی اس بے پایاں جذباتی ابال کی خارجی شکلیں ہیں۔ لیگ کے جلسے اور جلوس بھی عوامی سطح پر اسی جذبے کا اظہار رہے۔ خلافت کی تحریک کا جوش اور رومانی تحریک کا آئیڈیل ازم آپس میں سگی بہنیں ہیں۔ قائد کے سوانح نگار کی تحریروں میں خطابت کا پرشوکت اسلوب بھی ہے اور مثالیت پسندی کا رومانی ذائقہ بھی۔ تحریک پاکستان سے وابستہ مصنفین کی تحریریں

میں تپش اور حدت اسی بیرونی ہل چل کا عکس ہے، جس سے معاشرہ متاثر تھا اور قائد کی ذات کو بندگی کی حد تک قبولنے سے نگارشات میں قائد کی شبیہ کچھ ماورائی ڈھنگ اختیار کر گئی ہیں۔

قائد پرستی نے ان تحریروں پر بھی اثر ڈالا ہے اور کبھی کبھی قائد کے پسندیدہ اقوال اور محبوب ترکیبیں غیر شعوری طور پر مصنفین کے اپنے اسلوب کا حصّہ بن گئی ہیں۔ اس مرحلے پر یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ سلیری، جمیل الدین احمد، رؤف اور اصفہانی تحریک پاکستان کے وقت جوان تھے اور جوانی جوش اور جذبے ہی کا دوسرا نام ہے۔

(۶۰)

سوانحعمریوں کے تکنیکی پہلوؤں کا تجزیہ اور ادبی اقدار و اوصاف کی وضاحت میں کئی سوال آتے ہیں۔ کیا ان میں قائد کی شخصیّت کے خدو خال پوری طرح ظاہر ہوئے ہیں؟ کہیں مصنفین نے اپنے ذاتی تعصبات کی آمیزش تو نہیں کردی؟ مبالغہ، تخیل کی رنگ آمیزی، اپنی خواہشات اور آرزوؤں کا عکس تو اس تصویر میں شامل نہیں؟ سوانح نگار مواد کی تعبیر و تشریح اور کردار کی بازیافت میں کس حد تک کامیاب ہے؟ ان اوصاف کی بنا پر سوانح نگار کا مسلک ناول نویس سے جدا ہو جاتا ہے۔ تاریخی ناول نویسی اور سوانح نگاری میں بین فرق ہے اور یہ فرق مواد اور پیشکش ہی کا فرق نہیں، واقعات کی تخیلی سطح پر دوبارہ تخلیق کرنے کے عمل میں اصل اور غیر اصل کا فرق بھی ہے۔ سوانح نگار واقعات کی صحت کو تفصیلات میں بھی قائم رکھتا ہے، لیکن ناول نویس تاثر کی تکمیل میں واقعات کی کانٹ چھانٹ کے ساتھ ممکنہ تبدیلیاں بھی کرتا ہے۔ اس کی حقیقت نگاری اصلیت کی پابند نہیں۔ وہ عام انسانی رویوں اور امکانی ردّعمل کا سہارا بھی لیتا ہے اور حقیقی واقعات و حقائق میں تبدیلیاں بھی کر لیتا ہے۔ سوانح نگار کردار کے اوصاف واقعات کی صحت ہی کی مدد سے بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہے ہمارے ہاں سوانح نگاری کے کم و بیش انداز رائج رہے ہیں، ایک کی رو سے شخصیت کی نقاب کشائی کی بجائے اس کا سہارا لے کر صرف واقعات کی ترسیل کی جاتی ہے اور مرکزی کردار صرف واقعات کے مربوط بیان کا وسیلہ ہوتا ہوتا ہے۔ دوسرا طریق وہ ہے جس میں واقعات کی مدد سے مرکزی کردار کے مختلف پہلو

نمایاں کئے جاتے ہیں۔ تیسرا طریق محض حالات زندگی کو بیانیہ طور پر اردو ادب میں پیش کرنے کا ہے۔ تینوں طرح کی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں۔ قائداعظم کی جملہ سوانح عمریاں بھی انہیں تین حصّوں میں منقسم ہیں۔

پہلے گروہ میں:

My leader. 'Meet Mr. Jinnah
Glimpses of Quaid-e-Azam The Great Leader.
Jinnah and the Making of Pakistan.

کو شمار کیا جاسکتا ہے۔ ان کتب کا مقصود اصلی قائد کی شخصیت کی ترجمانی نہیں بلکہ واقعات کے تار و پود یا قائد کے سیاسی عزائم کی داستان رقم کرنا ہے۔ واقعات پیش منظر میں اور ان کا بیان بھی اھم ہے۔

دوسرے گروہ نے شخصیت کے بیان کو اولیت دی ہے اور واقعات کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس کی مثال ہیکٹر بولائتھو کی (Jinnah) "جناح" ہے۔ بغور دیکھا جائے تو حیات قائد پر جملہ کتب میں زیادہ تعداد وہ ہے جس میں قائد کی زندگی کا صرف ایک رُخ سامنے رہا ہے یعنی ان کا سیاسی کارنامہ۔ تیسرے گروہ میں عموماً دوسرے اوصاف یا تو سرے سے دکھائی ہی نہیں گئے یا ان کا معمولی سا بیانیہ ذکر ہوا ہے، پیدائش، تعلیم اور زندگی کے دوسرے واقعات صرف قاری تک پہنچائے گئے ہیں، ان سے قائد کی شخصیت کے نفسیاتی عوامل کی طرف توجہ کر کے حقائق اور شخصیت کے درمیان عمل اور ردِّ عمل کو موضوع نہیں بنایا گیا۔

جی الانہ کی کتاب 'Quaid-e-Azam. The Story of a Nation' کا طریق سوانح نگاری کا یہی پرانا دستور ہے جو اردو میں بیسویں صدی کی تیسری دھائی میں عام طور پر مروج رہا ہے۔

(۷)

ادب اور تاریخ ان تین طریقہ ہائے کار کے سماجی، سیاسی اور ادبی اسباب کیا ہیں؟ اس پر غور کیا جائے تو مشترک طور پر بعض واقعات بالواسطہ اثرانداز ہوئے ہیں۔

رؤف، عبداللطیف، سلیری، جمیل الدین اور جی الانہ کا دورِ جوانی ایسے زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب دنیا بھر میں اقتصادی بحران تھا اور تعلیم یافتہ طبقہ ملازمت کے حصول میں ناکام اور زندگی کی عام تگ و دو میں اپنے آپ کو بے بس اور بے اختیار محسوس کر رہا تھا۔ ۱۹۳۰ء کے قریب عالمی اقتصادی بدحالی نے برصغیر میں بعض نئی مشکلات پیدا کر دی تھیں، مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کا شیرازہ تحریکِ خلافت کے بعد سے بکھر گیا تھا اور ان کی توجہ عالمِ اسلام سے ہٹ کر برصغیر کے مسائل کی طرف ہو رہی تھی۔ سیاسی جدوجہد کا جوش و خروش احساسِ شکست کا نقش چھوڑ گیا تھا۔ ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، ظفر علی خاں، اور اقبال کی نظم و نثر نے بے روزگار نوجوان طبقے کو پیغامِ عمل سے آشنا کر رکھا تھا لیکن کوئی مربوط اور منضبط پروگرام ابھی وضع نہ ہوا تھا اور جوش و ولولہ داخلی تنظیم اور تہذیب سے بھی شناسا نہ ہوا تھا۔ اس خلا کو پر کرنے کے لئے بعض نیم فوجی، نیم اصلاحی، تنظیمیں میدان میں اتر چکی تھیں اور کامیاب بھی ہو رہی تھیں۔ ہندوؤں میں بیداری کی لہر اور کل ہند بنیادوں پر اپنے آپ کو مستحکم کرنے کا خیال کروٹیں لے رہا تھا۔ حصولِ آزادی کی خواہش نے شدت اختیار کر لی تھی۔ پنجاب اسی زمانے میں خاص ہندو احیائی تحریکوں کا مرکز تھا۔ پنجاب کی شہری آبادی سیاسی طور پر بیدار ہو رہی تھی۔ اگرچہ دیہات میں ابھی تک سناٹا تھا اور وہاں بڑے بڑے زمیندار مسندِ اقتدار پر متمکن تھے۔ یونینسٹ پارٹی اسی دیہاتی شہری امتیاز کے سہارے تشکیل پذیر ہوئی تھی۔ یہی پنجاب کا مقتدر طبقہ تھا جسے حکومت کی اعانت حاصل تھی۔ پنجاب کا نوجوان اس صورتِ حال میں اپنے آپ کو ہار رہا تھا۔ علی گڑھ اور اس کے آس پاس بھی کیفیت زیادہ مختلف نہیں تھی۔ داخلی اضطراب نے کئی تحریکوں کو جنم دیا۔ شہید گنج تحریک، تحریکِ کشمیر اور دوسری سیاسی، دینی تحریکیں بھی اسی فضا کا نتیجہ تھیں۔ نوجوانوں کے خونِ گرم کو نصب العین کی تلاش تھی۔ ادب کی چاردیواری میں اقبال اور ظفر علی خاں کی شاعری نے شہرت پائی۔ اسی کے متوازی رومانی تحریک پنپ رہی تھی جس نے نوجوانوں کے جذبات میں خاص طرح کی ماورائیت کا بیج بو رکھا تھا۔ رومانی تحریک کا ایک پرت مثالیت پرستی (Idealism) بھی ہے جس میں ادب محبوب کی ذات اور خارجی ماحول کو رنگین عینک سے دیکھتا ہے۔ دوسرا پرت

جذبۂ بے اختیار کا اظہار ہے جس میں مرکزی توجہ کسی ماورائی اور خارج از حقیقت دنیا کا تصوراتی نقشہ ہے۔ اقبال کے پیغام اور اختر شیرانی کی شاعری کے بظاہر متبائن راستوں میں نوجوانوں کی خواہشات کے ہیولے گھوم پھر رہے تھے۔ رؤف، سلیری اور جمیل الدین احمد حقائق کو رومانی زبان ہی میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اور انھیں اپنے راہنما سے اسی طرح کی بے پناہ محبت ہے جیسے شعراء کو اپنے محبوب سے ہوتی ہے۔ بات کو دوٹوک کہنے کی بجائے اس کے بیان کے لئے پیچیدہ اور لمبا راستہ پسند کیا جاتا تھا۔ قاری جملوں کی خوبصورتی اور تشبیہ و استعارے کی کثرت سے لطف اندوز ہوتا ہے، ٹیگور اور آسکر وائلڈ کے اثرات اس زمانے کے لب و لہجے پر چھائے ہوتے ہیں۔ بات کا بتنگڑ بنانے اور معمولی اور پیش پا افتادہ تجربات کو انوکھے تجربات سمجھ کر انھیں بنا سنوار کر دلکش اور جاذب بنانے کا رویہ اس دور کے اردو ادیبوں میں عام ہے، قائد کے اسی دور کے سوانح نگار بھی ان اثرات سے الگ نہیں۔ تکرار کے علاوہ مواد کو پھیلانے کا خیال بہت ہے۔ آج کا قاری یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ یہی بات اس سے کم صفحات میں بھی بہ آسانی کہی جا سکتی تھی۔

قائد کی ذات کے ساتھ عقیدت اور بے پناہ محبت نے ان سوانح نگاروں کو مسحور کر رکھا ہے اور مثالیت کی قوت اپنا آپ ظاہر کئے بغیر نہیں رہتی۔ بلاشبہ اچھا سوانح نگار اپنے موضوع سے ہمدردانہ روش رکھ کر ہی اس کی تصویر کشی میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن اگرچہ بات کی شدت فن کار کے اعصاب کو بھی متاثر کر دے تو نتیجے میں جو تصویر بنے گی وہ اصل سے زیادہ شوخ اور حقیقت سے کسی قدر بعید بھی ہو سکتی ہے۔ معروضیت کے بغیر سوانح نگاری کی کامیابی کا امکان بہت مشکل ہے۔ ان نوجوان مصنفین کے ہاں قائد کی حیثیت ایک مرشد کی سی ہے۔ خلوصِ محبت اور احترام و عقیدت کے جذبات کتابوں میں موجزن ہیں، یہ جذباتی رویہ ایک لحاظ سے اہم بھی ہے اور مصنفین کی طوالت نویسی کی تلافی کرتا ہے۔ عقیدت کے غیر معمولی اظہار نے واقعات کی تعبیر و تشریح میں ہمدردی اور محبت کو شامل کیا ہے۔ اگرچہ یہ کتابیں ایک ہنگامی اور وقتی ضرورت کو پورا کرتی ہیں لیکن یہ آج بھی ایک اعتبار سے زندہ ہیں اور اپنی بعض معمولی کوتاہیوں کے باوجود قومی احساس کو بیدار رکھنے کا باعث ہیں۔ قائد سے محبت اور عقیدت کی بنا پر ان مصنفین نے بعض جگہ قائد کے اسلوب کی تقلید بھی کی ہے۔

اُردو ادب کے حوالے سے دیکھیں تو یہ زمانہ بہت اہم ہے۔ اُردو کے ادبا نے اس دور میں لاتعداد سوانح عمریاں لکھیں۔ مربوط تاریخ نویسی کی جگہ اشخاص کی زندگی زیادہ قابلِ توجہ تھی۔ حالیؔ، شبلیؔ اور آزادؔ کی سوانح نگاری نے اُردو میں ایک مستقل روایت کی بنا ڈالی۔ انھیں نے بعض عظیم شخصیتوں کے بارے میں لکھ کر ماضی کی شاندار روایات سے روشناس کرایا۔ تحریکِ خلافت کے زمانۂ عروج میں یہ احساس ادیبوں کے ہاں عام تھا کہ شخصیتوں کے حالات لکھتے ہوئے صرف ان پہلوؤں پر زور دیا جائے جو سبق آموز ہوں اور وہ عناصر دبا دیئے جائیں یا ان کا ذکر ہی نہ ہو جو اس بنیادی ضرورت سے انحراف کا سبب ہوں۔ بزرگوں کو صرف نیکیوں سے یاد رکھنے کا یہ طور رفقائے سرسید سے شروع ہوا، اور اسی زمانے میں آکر اپنے منطقی نتیجے کو پہنچا۔ اب ہر ہیرو مہات سرکرتا نظر آنے لگا۔ اور آئیڈل ازم نے ادب میں اپنا تسلط جما لیا۔ مثالی راہنماؤں کی پرستش بھی کی گئی اور ان کی حیات اور کارنامے موضوعِ ادب بھی بنے۔ ہندو مصنفین نے مہاتما گاندھی، سوامی رام تیرتھ، سیواجی اور گوکھلے پر خامہ فرسائی کی۔ عظیم مغل بادشاہوں کے کارنامے بھی بیان ہوئے اور مسلمانوں نے اپنے شاندار ماضی کو سامنے رکھ کر دینی مفکروں، عباسی دور کے علماء اور سپین کے فرماں رواؤں پر کتابچے لکھے۔ اپنے اپنے ہیرو کو بڑھ چڑھ کر عظیم دکھایا گیا۔ اس دور میں صوبائی شخصیتیں بھی ادب کا موضوع بن گئیں اس طرح مختلف علاقوں نے اپنی اپنی اہلیت جتانے کی کوشش کی حتیٰ کہ اُردو کے آغاز کا سہرا بھی ہر مصنف نے اپنے ہی علاقے کے سر باندھا۔ جمیل الدین احمد اور ان کے ساتھی بھی اس فضا میں سانس لیتے تھے اس لئے ان کی سوانح عمریاں بھی اصلاحی ہیں، ان میں قائد کے ذاتی اوصاف کا بیان بہت کم اور ان کے مشن کا ذکر زیادہ ہے۔ جاں نثاری اور جاں سپاری کا اظہار بھی اسی عقیدتی فضا کا مرہونِ منت ہے۔

فنی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ کتابیں یک رُخی ہیں۔ ان کی بیان کردہ تصویر نامکمل اور کہیں کہیں مبالغہ سے خالی نہیں۔ تاہم عینی شاہد کی حیثیت سے ان کی براہِ راست حاصل کردہ معلومات مستقبل کے مؤرخ کے کام آسکتی ہیں۔

(۸)

دوسرے گروہ کی کتابوں میں بولائتھو کی 'جناح' کا نام اہم ہے، یہ قائد کی پہلی مکمل سوانح عمری ہے جو سرکاری سرپرستی میں شروع کی گئی۔ ۱۹۵۴ء میں کتاب ضبطِ تحریر میں آئی۔ اس میں قائد

کی پوری زندگی کو سامنے رکھا گیا ہے۔ مصنف کی زبان اور لہجہ دلکش اور دل فریب ہے لیکن متن پر بعض دوسرے عوامل بھی اثر انداز ہوئے ہیں، اس لحاظ سے یہ کتاب ۱۹۵۰ء کے سرکاری نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہے۔ کتاب کی تدوین میں ایک اہم وسیلہ محترمہ فاطمہ جناح کی تحویل میں ریکارڈ استعمال نہیں ہو پایا۔ اس لیے کتاب میں خلا رہ گئے ہیں۔ اس کی تلافی بعض نامور شخصیتوں کے انٹرویوز سے کی گئی ہے، قائداعظم کی بیماری اور قیام گاہ بمبئی کے سلسلے کی معلومات نئی ہیں۔ ابتدائی حالات کے لئے افرادِ خاندان تک رسائی حاصل کی گئی ہے۔ اس سے قائد کی ابتدائی زندگی کے بعض گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ بعد میں جی الانہ نے انھیں افراد اور بعض دوسرے ذرائع سے ان حقائق پر اضافہ بھی کیا ہے۔ مجموعی طور پر کتاب میں کچھ قباحتیں بھی ہیں۔ سرسری اور سامنے کے مواد سے ماخوذ نتائج سے بعض واقعات کا تناظر بگڑ گیا ہے اور مصنف کے ذاتی تعصبات بھی شامل ہو گئے ہیں۔ جون ۱۹۴۷ء کے مذاکرات سے مصنف کا یہ استخراج کہ گاندھی اور جناح کی وائسرائے سے ملاقات سے پہلے باہمی ملاقات ہو جاتی تو یہ امر مفید ہوتا لیکن بقول اس کے بدقسمتی سے دونوں لیڈروں کا غرور آڑے آیا اور باہمی تعاون ناممکن ہو گیا[1] حقائق کی ایسی تاویل ہے جو قائد کی حد تک ناانصافی پر بھی مبنی ہے۔ اسی طرح ان کا یہ خیال کہ مارچ ۱۹۴۲ء میں کانگریس اور لیگ کے راہنما یہ سمجھتے تھے کہ برطانیہ جنگ ہار جائے گا۔ لہٰذا دونوں نے کرپس کی تجویز کو مسترد کر دیا[2]، برطانوی نقطۂ نظر کی نمائندگی ہو تو ہو، لیگ کے ساتھ انصاف نہیں۔ شواہد و قرائن اس کے خلاف ہیں کہ لیگ کے راہنماؤں نے برطانیہ کی شکست کو یقینی جاننے کی بنا پر انکار کیا ہو۔ قائد کی صفائی پسند طبیعت کے باب میں ان کا یہ تبصرہ کہ "یہ خبط کی حد تک پہنچ چکی تھی"[3] ایک ظالمانہ تعمیم ہے جس کا اطلاق قائد کو نفسیاتی مریض قرار دیئے بغیر نہیں ہو سکتا۔ قائد کے بارے میں بولاتھو کا منفی طرزِ عمل کئی جگہ undertones کے روپ میں بھی آیا ہے، مثلاً فرماتے ہیں "پچاس برس پہلے جناح نے تھیٹر میں اداکاری کا جو تجربہ حاصل کیا تھا اس کا اثر اس آخری تقریر میں جھلکتا ہے"[4]۔ حقائق کو باہم ملانے کا یہ انداز مصنف

۱۔ محمد علی جناح (اردو ترجمہ)، ص ۲۱۵۔ ۲۔ ایضاً۔ ص ۲۱۹۔
۳۔ ایضاً۔ ص ۲۲۲۔ ۴۔ ایضاً۔ ص ۲۴۰۔

کا اپنا ہے وہ بہ آسانی قائد کے اسلوب بیان کو برطانوی پارلیمنٹ کے اراکین کا اثر بھی کہہ سکتے تھے۔ اس معاندانہ روش کا سراغ شاید ان تعلقات میں بھی تلاش ہو سکتا ہے جو اس وقت کی حکومت اور محترمہ فاطمہ جناح کے درمیان پائے جاتے تھے۔

بولائتھو کی یہ تصنیف اپنے تخیلاتی پرتو کی وجہ سے مستند سوانح عمریوں کی صف میں نہیں آتی۔ مواد کی کمی کو انھوں نے اکثر جگہ تخیل کے زور سے پورا کیا ہے۔ قائد کے بچپن کے حالات اور ابتدائی تعلیم سے متعلق مواد کو تخیل کے زور سے مربوط کرتے ہوئے بہت سے خلا اٹکل سے پر کئے ہیں۔ اس سے قائد کی شخصیت کا جو نقش ابھرا ہے، اس میں اصل اور تخیل دونوں کی کارفرمائی ہے۔ آخر عمر میں قائد کا لان میں بیٹھنا بھی اس طرح کی طلسم نگاری کا ذریعہ بنا ہے، اس سے یہ کتاب تاریخی ناول کے ذیل میں چلی جاتی ہے۔ اسے مستند سوانح عمری تصور کرنا مشکل ہے۔ حقائق کی صحیح شناخت کے لئے اس کے مقابلے میں مسٹر اصفہانی اور مطلوب الحسن سید کی کتابیں زیادہ وقیع ہیں۔ وہ شخصیت نگاری کے ذیل میں تو نہیں آتیں لیکن واقعات کے لحاظ سے مستند ضرور کہی جا سکتی ہیں۔

(۹)

سوانح نگاروں کا تیسرا گروہ شخصیت کا نقش گر نہیں لیکن حالاتِ زندگی کی ترسیل کا ماہر ہے۔ یہ ہمارے ہاں کی روایتی سوانح نگاری کا نمونہ ہیں جس میں شخصیت کے خدوخال کی بجائے محض شخصیت کا حوالہ آتا ہے اور حالاتِ زندگی بلاکم و کاست درج کئے جاتے ہیں۔ مطلوب الحسن سید، اصفہانی اور سلیم ایم ایم قریشی کی کتابیں اس ذیل میں شمار ہو سکتی ہیں۔

مطلوب الحسن سید کی Muhammad Ali Jinnah, Political biography، خونِ گرم کی بجائے متوازن لہجے کی غماز ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں چھپا اور آخری ۱۹۷۰ء میں۔ درمیان میں ردوبدل اور ترمیم و اضافہ بھی ہوا جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ مصنف نے اگرچہ قائد کے جملہ حالات لکھے ہیں لیکن اس کی اصل توجہ ان کے سیاسی کردار پر ہے۔ اور سوانح کا سانچا وہی ہے جو اب سے چالیس سال پہلے اردو میں مقبول تھا اور جس کے نمونے انگریزی زبان میں وکٹورین عہد میں ملتے ہیں۔ وہی روایتی طرز جس میں کسی وزیر، کسی فرماں روا، کسی عظیم شخصیت، کسی بہادر جنگ جو کے کارنامے لکھے جاتے تھے۔ حالاتِ زندگی پیدائش سے وفات تک سیدھے سیدھے بیانیہ اسلوب میں تاکہ سند رہے اور آنے والی نسلیں

اس سے سبق حاصل کرلیں۔ مطلوب الحسن سید بھی سیدھے سبھاؤ ایک نئی بنائی لکیر پر چلتے گئے ہیں۔ انداز معتدل، مؤثر اور ہمدردانہ ہے جس سے پاکستانیت جھلکتی ہے۔

مطالبۂ پاکستان کے بارے میں مصنف کے اس نقطۂ نظر سے اتفاق ممکن نہیں کہ یہ تحریک منفی ردِ عمل کے تحت کامیاب ہوئی۔ انھوں نے قائد کے زمانے کے نوجوان مصنفین کی تحریروں سے دھوکا کھایا ہے اور یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مطالبۂ پاکستان کا ردِ عمل اس منفی احساس کا نتیجہ ہے کہ ہندوؤں نے ہٹ دھرمی دکھائی، اگر ہندو مفاہمت پر آمادہ ہوتے تو پاکستان کی تشکیل ہی نہ ہوتی۔ تحریکِ پاکستان کے عروج کے وقت سیاسی حالات کے دھارے میں واضح خیال جو عوام کے لئے بھی قابلِ فہم تھا اور جسے ایک نعرے کا درجہ مل سکتا تھا اور جس سے جذبات متحرک اور فعال ہو سکتے تھے، بلاشبہ یہی خارجی عنصر ہے کہ ہندوؤں کی ضد نے مسلمانوں کو آمادۂ عمل کیا۔ لیکن کوئی تحریک منفی قدروں کے سہارے کامیاب نہیں ہو سکتی، مطالبۂ پاکستان کا ضروری اور قابلِ محسوس رنگ ہندوؤں کے خلاف ردِ عمل سہی لیکن یہ فوری سبب ہے۔ تحریک کے کچھ باطنی گہرے اور دور کے اسباب بھی تھے جن سے تحریک مسلمانوں میں شہرت بھی پا سکی اور کامیابی کی منزل تک بھی پہنچی۔ یہ باطنی اسباب تحریک کی اصلِ اساس ہیں۔ تحریک میں شامل اشخاص کی نظر واقعات کے منجدھار میں ان گہرائیوں تک نہیں جا سکتی تھی۔ فکری بنیادیں اس لئے ان کی نظر سے اوجھل رہیں جو تحریک کی اصل کامیابی کا سبب تھیں۔ بعد کے مؤرخ اس ردِ عمل کو اصل اور پوری حقیقت سمجھ بیٹھے اور اس سے ایک اور منطقی نتیجہ بھی نکال لیا کہ اس تحریک کے اصل ہیرو کانگریسی راہنما تھے۔ جس طرح (Passive Voice) کا مصنف اس تحریک کی کامیابی کی داد پٹیل اور گاندھی کو دیتا ہے، اسی طرح ہمارے جدید مؤرخ بھی ہندوؤں ہی کو پاکستان کے تصور کا بانی قرار دینے سے گریز نہیں کرتے۔ گویا ہمارے اپنے راہنما کی مساعی کے مقابلے میں ان ہندوؤں کا احسان زیادہ ہے۔ مطلوب الحسن سید کے ہاں بھی یہی منفی رجحان بین السطور میں ہے اور ایک اور جگہ ابھر کر قاری کے لئے تشویش کا سبب بھی بنا ہے۔ فرماتے ہیں:

Lalput Rai was therefore the poineer of two movements in India, one among Hinduswhich culminated in the final political stand of the Hindu Mahasabha and the Indian National Congress and the other among Muslims that received an impetus by the famous Lahore

Resolution of the All India Muslim League of 1940. But while one was the direct result of Rai's endavours, the other was the inevitable shadow of this view point.

اپنی کامرانیوں کو دوسروں کے حوالے کرنے کی مثال شاید اس سے بہتر نہ مل سکے۔ اصل اور بنیادی محرکات کو نظرانداز کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ تحریکِ پاکستان کے وہ پہلو جو پاکستانی ملّی تشخّص میں راہبر ہو سکتے تھے، پسِ پشت جا پڑے اور مسلمانوں کی تمدنی تاریخ سے برآمد ہونے والے داخلی عوامل ایک بڑی حد تک نظرانداز ہوئے۔ ہمارے مصنفین کو یہ احساس بھی نہ ہو سکا کہ دوقومی نظریہ کی تاریخ لاجپت رائے سے بہت پیچھے جاتی ہے اور اس کا شعوری احساس برطانوی دَور میں عبدالحلیم شرر کو بھی ہوا اور اس کے بعد سال ہا سال تک اسے دوھرایا بھی جاتا رہا۔ آج کا پاکستانی اپنی پہچان ہندو کے حوالے سے کرنے سے قاصر ہے۔ اسے تمدنی افکار میں کارفرما فکری رویوں میں قومیّت کی تلاش و جستجو ہے منفی رجحانات کی تہہ میں پوشیدہ مثبت رویے اس تشخّص میں مدد دے سکتے ہیں۔

۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۹ء تک ہماری نظریاتی تاریخ جن مسائل سے دست و گریبان رہی ہے، ان کی شناخت سلیم ایم قریشی کی کتاب سے ہوتی ہے۔ کتاب غالباً مغربی قارئین کے لئے لکھی گئی تاہم وہ پہلے مؤرخ ہیں جنھوں نے ملّی تشخّص کے دُور رس عواقب کا جائزہ لے کر اس موضوع کے لئے ایک مستقل باب مختص کیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اپنے حاصل کردہ نتائج کو وہ دیگر ابواب میں پھیلا کر اس کی کڑیاں تاریخی واقعات سے نہیں ملاتے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اُنھوں نے کتاب غیر ملکیوں کے لئے لکھی اور کوشش یہ کی تاریخی واقعات کو ان کی پسندیدہ اصطلاحات کے حوالے اور سیکولر ذہن کو پیشِ نظر رکھ کر پیش کیا جائے۔ تجزیے کو دیگر ابواب میں نہ سمونے سے کتابوں کے دیگر ابواب اور نظریاتی باب میں مطابقت پیدا نہیں ہو سکتی۔ مغربی قاری کا ہوّا ان پر بھی کہیں کہیں مسلط ہوا ہے اور وہ بھی ایک آدھ جگہ معذرت آمیز جملے لکھتے ہیں۔ وہ قائد کو مغربی قاری کے ہاضمے کے خیال سے سیکولر ذہن کا مالک بنانے سے بھی گریزاں نہیں۔ انھیں اس بات پر بے حد اصرار ہے کہ قائد خالص سیاست دان تھے اور دین کی ملاوٹ کے قائل نہیں تھے۔ ان کے چند اقتباس اس طرزِ فکر کو واضح کرتے ہیں۔

لکھتے ہیں:

Jinnah was essentially a "pure politician" and an ardent nationalist, but he was primarily a Muslim nationalist and a nationalist Muslim. [1]

---

1. Op. cit. pp. 74-75

"نہیں" اور "ہاں" کی اس گردان سے مغربی قاری تو کیا مغالطے میں پڑے گا "صیاد" خود ہی "صید" بن گیا ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں:

It was the rejection of what he considered to be equitable sharing which compelled Jinnah to ask for equality of treatment, for which he devised the formula of Muslims being a Nation [1]

پھر فرماتے ہیں:

The Lahore Resolution was the higher and much accurate articulation combining all the Previous Muslim demands.

پھر کہتے ہیں:

The essentially secular Jinnah re emegens in his very first speech to the Constituent Assembly of Pakistan

گویا قائد کے ہاں حصولِ پاکستان کا سارا دھندا دراصل سیکولر تھا اور انھوں نے صرف تمدنی اور روحانی قدروں کا واسطہ دے کر ایک سیاسی چال چلی تھی اور چال اس لئے کامیاب ہوئی کہ مطالبے کی جڑیں مسلمانوں کے ملّی تشخص میں پیوست تھیں۔ قائد نے اسے صرف ایک سیاسی ہتھیار کے طور پر برت لیا۔

بعض مقامات پر کتاب میں غلطیاں بھی ہیں۔ صفحہ ۵۹ پر مارچ ۱۹۳۹ء میں یہ کہنا کہ مسلم لیگ نے ہر قسم کے فیڈرل نظام کی مخالفت کی تھی درست نہیں۔

اگر ایسا ہوتا تو قرارداد لاہور کو وفاقی اصطلاحات کے حوالے سے پیش نہ کیا جاتا۔ لیگ نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی وفاقی تعبیر کو رد کیا تھا۔ صفحہ ۸۴ پر اس خیال کا اظہار ہوا ہے کہ قائد نے سکھوں کی دلجوئی کی کوشش نہ کی۔ یہ بھی حقائق کی رُو سے درست نہیں۔

اس حصے کی ایک زیرِ بحث کتاب مسٹر اصفہانی کی Quaid-e-Azam as I knew him ہے۔ اس میں قائد کی شخصیت کو مؤثر انداز اور صحیح رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کوئی مربوط سوانحعمری نہیں، متفرق یادداشتوں اور خطوط کا مجموعہ ہے۔ جسے مصنف نے ذاتی تعلقات کے حوالے سے لکھا ہے۔ سیرت کے علاوہ تاریخی لحاظ سے بنگال میں مسلم لیگ کے ابتدائی ایام کا، اے کے فضل الحق

1. Ibid p. 80

کی کارستانیاں، قائد کی ٹوپی اور پاکستان کے جھنڈے کی تفصیلات کے ساتھ مسلم چیمبر آف کامرس کا قیام، اورینٹ ایئر ویز کی تاسیس اور مسلم کمرشل بنک کا اجرا بھی تاریخِ پاکستان کے وہ اجزا ہیں جن کے بارے میں کسی دوسری جگہ معلومات میسّر نہیں، کتاب کی اصل روح وہ چھوٹی چھوٹی حکایتیں ہیں جو قائد کی زندگی اور شخصیت سے متعلق ہیں۔ حکایت نگاری کا یہ طرز ہمارے قدیمی مختصر قصوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ جدید فنی ذرائع سے کنارہ کشی کے باوجود ان حکایات میں جان ہے اور مصنف ان کی مدد سے آہستہ آہستہ کتاب کے تار و پود میں قائد کی ذات کے بعض لطیف پہلو دکھاتا جاتا ہے۔ سوانح کی کتاب نہ ہوتے ہوئے بھی یہ دستاویز قائد کے کردار کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ وہ یہاں ایک زندہ اور گوشت پوست کے انسان معلوم ہوتے ہیں۔

(۱۰)

ہندو مصنفین نے قائد کو گرانے اور بدنام کرنے کی جو مہم شروع کی تھی۔ اس کے جواب میں مسلمان مؤرخین نے قائد کی عظمت کا سکہ بٹھانے کی کوشش کی ہے۔ مخالفت کا زور اگر ایک انتہا پر تھا تو دوسرے کا ردِ عمل دوسری انتہا تک چلا گیا اور قائد کی شخصیت کے تجزیے کا کوئی متوازن پیمانہ وضع نہ ہو سکا۔

ضرورت ہے کہ قائد کی شخصیت کا جائزہ نئے سرے سے لیا جائے اور یہ کام پاکستانی مؤرخین کے کرنے کا ہے۔